Regd. No. [illegible]
Telephone No. [illegible]
Telegram: "[illegible]"

قیمت سالانہ [illegible]
فی پرچہ [illegible]
یوم اشاعت
[illegible]

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہمارِی زبان

ایڈیٹر :- آل احمد سرور

جلد ۴ | علی گڈھ - ۸ مئی ۱۹۵۷ء | شمارہ ۱۸

ہندستانی تھیٹر کا ارتقاء

—— ماما وریکر، ممبر پارلیمنٹ

ہندستان میں تھیٹر کی داغ بیل زمانہ تاریخ کے قدیم ادوار میں ڈالی گئی تھی اور ہندستانی تھیٹر شاید یونانی تھیٹر سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ بہترین علما اور نقاد بھاس کو قدیم ترین ڈراما نگار قرار دیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مسیح سے ۵۰۰ سال قبل از مسیح سے لے کر ۵ سال قبل از مسیح تک کے زمانے میں ہوئے۔

بھاس کے بعد کالی داس، بھوبھوتی، وشاکھادت جیسے نامی تمثیل نگاروں نے تھیٹر کا دامن وسیع کیا۔ یہ ترقی کب رک گئی، یہ ٹھیک ٹھیک بتانا مشکل ہے۔

برطانوی حکومت کے قائم ہونے کے بعد اس ملک میں تھیٹر کو ایک نیا پیغام ملا اور اس کی تجدید کی گئی۔ یہ سن کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ ایک روسی شخص تھا جس نے ۱۷۹۵ء میں ایک انگریزی ڈرامے کا ترجمہ بنگالی میں کیا اور اسے اسٹیج پر پیش کرکے تھیٹر کی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ قریب قریب اسی وقت تنجاور میں بھی ایک نئی روشنی نظر آئی۔

اس ریاست کے مرہٹہ حکمران نے خود ایک ڈراما لکھا اور اسٹیج پر پیش کیا۔ اس کے بعد تامل زبان میں ڈرامے لکھے گئے اور ان حکمرانوں کی سرگرم سرپرستی میں کھیلے گئے۔ تھیٹر کی اس تجدید کے زمانے میں ہی کنڑ تھیٹر کی بھی ترقی ہوئی۔

ان زندگی بخش ہواؤں نے ۱۸۴۳ء میں مراٹھی تھیٹر میں بھی ایک نئی روح پھونکی۔ اس کے دس برس بعد بمبئی میں گجراتی تھیٹر اور اردو تھیٹر کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔

ہندی میں جو بہار اور بنگال کی علاقائی زبان تھی، کسی بھی وقت تھیٹر کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ چنانچہ ایک سو سال پہلے جب ڈراما نگار بھارتیندو ہریش چندر نے اپنی ایک روایت قائم کرنے کی کوشش کی تو اس کا ناکام ہونا ایک عجیب بات تھی۔ لہٰذا ہندی تھیٹر کی "اہلیہ" اسی وقت سے اپنے "رام" کی منتظر تھی کہ وہ آئیں اور اس کی پتھر کی بے جان صورت میں جان ڈالیں۔

ان باتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف بنگال اور مہاراشٹر نے ہی اپنے یہاں تھیٹر کی مکمل ترقی کا زمانہ دیکھا۔ اس سلسلے میں گجرات کا نمبر تیسرا ہے۔ جہاں تک اردو تھیٹر کا تعلق ہے یہ اصل میں مہاراشٹر کا ہی بچہ تھا۔ کیونکہ اس کا جنم بمبئی میں ہوا تھا لیکن اس کی پرورش پارسیوں کے ہاتھوں ہوئی، جو گجراتی بولتے تھے۔ اس میں زیادہ تر دوسری زبانوں کے ڈراموں کے ترجمے پیش کیے جاتے تھے۔ شاید یہ اس کی ایک بڑی خصوصیت تھی جو بعد میں گجراتی تھیٹر میں بھی نمایاں اہمیت اختیار کر گئی۔ اس کے علاوہ اردو اور گجراتی اسٹیج کے بہت سے فنکار مراٹھے تھے۔ بہرکیف مراٹھی تھیٹر ان دونوں سے زیادہ آگے تھا۔

اس ضمن میں سب سے پہلے بنگال نے ترقی کی۔ بنگالی تھیٹر کی یہ مضبوط بنیاد گرش چندر گھوش نے ڈالی جو بیک وقت اداکار بھی تھے، پروڈیوسر بھی اور تمثیل نگار بھی۔ انھوں نے متعدد بنگالی تھیٹریکل کمپنیاں شروع کیں۔ انھوں نے ۸۰ ڈرامے لکھے۔

انھوں نے نثر میں بھی ڈرامے لکھے اور نظم میں بھی اور ترجمے بھی لکھے اور طنزیے بھی۔ انھوں نے اس میدان میں آزاد شاعری سے بھی استفادہ کیا اور اسے "گرش چھند" کے نام سے موسوم کیا۔ دوسرے تمثیل نگاروں کی تربیت بھی گرش بابو کے زمانے میں ہوئی چنانچہ ان کی روایت برقرار رہی۔

گزشتہ دس برس میں ایک نئے شخص "جیالادی" اس میدان میں داخل ہو گیا ہے۔ اس نے اس روایت کی تجدید نو کی کامیاب

کوشش کی ہے اور اس میں اور مغربی تھیٹر میں یک رنگی پیدا کر دی ہے لیکن میری رائے تو یہ ہے کہ اگرچہ بھارت میں بنگالی تھیٹر کی بنیاد دوسرے علاقائی تھیٹروں کی بہ نسبت زیادہ مضبوط ہو گئی ہے تاہم ابھی تک اسے ایک ایکٹ اور ایک سین کے ڈراموں میں مہارت حاصل نہیں ہوئی۔

اس کے مقابلے میں مراٹھی تھیٹر نے بہت ترقی کی ہے اس کا آغاز مذہبی ڈراموں سے ہوا تھا لیکن اس کے بعد جلد ہی یہ دو شاخوں میں منقسم ہو گیا۔ ایک نثر کی اور دوسری سنگیت کی۔ نثر کے ڈراموں کی بنیاد شکسپیئر کے ڈراموں کے تراجم تھے جبکہ سنگیت ناٹک کالی داس کی تصانیف کے ترجمے تھے۔ دوسروں کی تصانیف پر یہ انحصار بھی جلد ہی ختم ہو گیا اور مراٹھی میں طبع زاد ڈرامے لکھے جانے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب مترجم ڈراموں کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔

بنگال کی تقسیم کو ختم کرانے کی تحریک میں تھیٹر نے ایک اہم پارٹ ادا کیا۔ اس نے عوام میں بیداری پیدا کرنے کے لئے ایک اچھے ہتھیار کا کام کیا۔ ڈرامے پر پابندی بھی سب سے پہلے بنگال میں لگائی گئی۔ اور اس کے بعد یہ علم مراٹھی تھیٹر نے بلند کیا لیکن بنگال اس سلسلے میں ثابت قدم نہیں ہوا اور جلد ہی میدان سے ہٹ گیا چنانچہ اس کے بعد صرف مہاراشٹر ہی نے ڈرامے کا استعمال عوامی ایجی ٹیشن کے ایک ذریعے کے طور پر کیا اور تا حال اس معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ مراٹھی تھیٹر کو ہمیشہ تجربوں کا شوق رہا ہے اور انہی کی بدولت اس نے کافی ترقی بھی کی ہے۔

جب ملک میں فلم انڈسٹری کا دور دورہ شروع ہوا تو اردو تھیٹر تو بالکل ہی تباہ ہو گیا۔ البتہ مراٹھی اور گجراتی تھیٹر کسی طور زندہ رہے یہ سچ مچ تعجب کی بات ہے کہ اس سخت دھکے کے باوجود یہ برابر نئے تجربے کر رہے ہیں۔

گزشتہ چالیس برسوں میں مراٹھی تھیٹر کی بہت توسیع ہوئی لیکن مراٹھی تھیٹر کو کبھی بھی محض تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھا گیا اس نے اخبارات سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ آزادی کے کاز کی خدمت کی اور لوگوں میں غیر ملکی حکومت کے خلاف جذبہ پیدا کیا اس طرح تھیٹر کی ترقی خاص کر ان لوگوں کی مرہون منت ہے جنہوں نے جدوجہد کو اپنا شیوہ بنایا۔ اس کے نتیجے کے طور پر مراٹھی کے ڈراما نگاروں اور تھیٹریکل کمپنیوں کو حکومت کی زیادتیوں کا شکار بھی بننا پڑا مگر مراٹھی تھیٹر اس سے مس نہ ہوا اور برابر اپنے عزم پر قائم رہا۔ اس نے جدوجہد کی جو قسم کھائی تھی وہ اتنی مقدس تھی کہ چھوڑی نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے برعکس گجراتی تھیٹر سرمایہ داروں کے تابع رہا۔

حال ہی کے کچھ برسوں میں تھیٹر کو تعلیمات عامہ کا ایک ذریعہ بنانے کی کوششیں کی گئیں ہیں مگر قدامت پسندی کی جڑیں اتنی مضبوط ہیں کہ تھیٹر کی نوعیت میں کوئی فوری تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

یہ غالباً اڑیسہ اور بنگال کے درمیان گہرے تعلق کا اثر ہے کہ اڑیسہ میں تھیٹر کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر ابھی یہ اپنے ابتدائی دور میں ہے۔ یہی بات آسام کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ البتہ منی پور میں اس کی اپنی تھیٹر کی شاندار روایات موجود ہیں اگرچہ اسے کسی بھی طرح جدید نہیں کہا جا سکتا پھر بھی یہاں لوگوں میں اداکاری کا جوہر موجود ہے کیونکہ منی پور ہندوستانی رقص کا ایک اہم ترین مرکز رہا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں تکنیک کا پیمانہ پن ایک موثر ڈراما پیش کرنے کی راہ میں رکاوٹ ثابت نہیں ہوا ہے۔

اگر دیکھا جائے تو بھارت میں قدیم ترین تھیٹر کا مرکز دکن میں رہا ہے لیکن وہاں اسے زیادہ ترقی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ چونکہ دکن میں کنڑ، تیلیگو، تامل اور ملیالی اسٹیجوں پر موسیقی کا ضرورت سے زیادہ استعمال کیا گیا ہے اس لئے تھیٹر پر موسیقی ہی موسیقی حاوی ہے اور اداکاری کی اہمیت ختم سی ہو گئی ہے۔ آج کل جن جدید ناٹکوں کا چرچا عام ہے ان میں فلم تکنیک کا ہوشیاری سے استعمال کیا گیا ہے۔ مگر اس سے تھیٹر کے زوال و انتشار کی رفتار ہی تیز ہو گی اور کچھ نہیں ہوگا۔

ہندی ہماری قومی زبان بن گئی ہے اور صرف یہی اپنے اندر ۱۴۔ زبانوں کے ادب کو سمو کر ہمارے اندر ایکے اور اتحاد کا احساس پیدا کر سکتی ہے۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس ادب کے پرچار کے لئے ڈراما ایک موثر ترین ذریعہ ہے۔

اس ضمن میں آل انڈیا ریڈیو نے ایک اچھے سلسلے کا آغاز کیا ہے۔ چنانچہ مختلف زبانوں کے ڈرامے یک وقت ملک کے تمام ریڈیو سٹیشنوں سے نشر کئے جاتے ہیں۔ یہ چیز یقیناً قابل تعریف ہے۔ کیونکہ اس سے علاقائی تھیٹروں کے درمیان باہمی تبادلے کی رفتار تیز ہو گی اور تھیٹر کی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا مگر محض یہ اقدام کافی نہیں ہے ہمیں ایک نئی قومی زبان میں ایک نئے تھیٹر کی تعمیر کرنی ہے

(باقی ص ۱۲ پر ملاحظہ کیجئے)

اردو کانفرنس

انجمن ترقی اردو ہند کی مجوزہ اردو کانفرنس علی گڑھ میں ۳۰-۳۱ جولائی ۱۹۵۵ء کو منعقد ہوگی پروگرام عنقریب شائع ہوگا اور مدعو حضرات کی خدمت میں بھیجا جائے گا۔

ہماری زبان

۸ مئی ۱۹۵۷ء

جنگ آزادی یا غدر

ایک طرف ۱۸۵۷ء کی شورش کی یادگار منانے کے لئے عوام اور حکومت دونوں پروگرام بنا رہے ہیں، دوسری طرف کچھ مورخ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ محض سپاہیوں کی بغاوت تھی اور اس کے پیچھے کوئی قومی جذبہ یا ملکی تحریک نہ تھی۔ ابھی حال میں ڈاکٹر آر سی مجمدار کی کتاب کے متعلق کچھ خبریں اور کچھ تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی رائے پر صحیح تنقید تو کتاب دیکھ کر ہی کی جاسکتی ہے مگر تبصروں سے ان کی رائے کا کچھ اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ بہادر شاہ، نانا صاحب، رانی جھانسی یا تانتیا ٹوپی قومی ہیرو نہیں کہے جاسکتے۔ ان لوگوں نے حالات سے مجبور ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ شورش زیادہ تر سپاہیوں تک محدود تھی جس میں آخر میں کچھ فوجی افسر اور کچھ بڑے راجہ یا نواب شامل ہو گئے تھے۔ اور نہ صرف سکھ اس سے علیحدہ رہے بلکہ بنگال، بہار، اتر پردیش، دہلی اور پنجاب کے کچھ علاقے کے سوا، باقی ملک کے باشندے انگریزوں کے ساتھ رہے۔ ان کو یہ بھی کہنا ہے کہ اس ہنگامے کے پیچھے کوئی باقاعدہ سازش یا سوچی سمجھی اسکیم بھی نہ تھی۔ غرض وہ اس شاندار واقعے کو صرف ایک محدود شورش یا بغاوت ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس وقت تک وہ قومی شعور پیدا نہیں ہوا تھا جو انیسویں صدی کے آخر کا عطیہ ہے لیکن انگریزوں کے خلاف نفرت کافی نمایاں تھی۔ اول تو وہ ریاستیں جیسے اودھ جن کا زبردستی برطانوی حکومت میں الحاق ہو گیا تھا، پھر انگریزی افسروں کا رویہ ہندوستانیوں کے ساتھ نہایت برا تھا۔ سرسید نے اسباب بغاوت ہند میں اس کی تشریح کی ہے۔ نیز علماء مذہبی اور سیاسی دونوں پہلوؤں سے انگریزی حکومت کو برا سمجھتے تھے۔ ہندوستان کی دولت انگلستان پہنچ رہی تھی اور ملک مفلس ہو رہا تھا۔ دیسی ریاستیں اگرچہ زوال کا شکار تھیں مگر وہ ایک تہذیبی رول بھی ادا کر رہی تھیں اور ان کے ساتھ ایک وفاداری کا جذبہ بھی قدرتی طور پر موجود تھا۔ اس لئے جب یہ بیزاری کارتوسوں کے واقعے سے پھوٹ پڑی تو اسے مناسب ہوا اور نقصان بھی۔ اگر ہندوستانی آپس میں بٹے ہوئے نہ ہوتے، اگر انگریزوں کو بجائے ایک ایک کر کے ہر مورچہ فتح کرنے کے دہلی میں باغیوں کی متحدہ طاقت سے مقابلہ کرنا پڑتا، اگر باغیوں کی قیادت زیادہ ذہین، باقاعدہ اور متحد ہوتی تو شاید حالات دوسرے ہوتے۔ بہادر شاہ، رانی جھانسی، نانا صاحب یا تانتیا ٹوپی ہیرو ہوں یا نہیں مگر انھوں نے بہرحال ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ ان کے ساتھ مقامی تہذیبی اور تاریخی روایات تھیں۔ ان روایات نے انھیں اس طوفان میں ایک نمایاں حیثیت دے دی۔ باغی سپاہیوں نے بلاشبہ بعض مقامات پر بڑی بربریت کا مظاہرہ کیا، مگر انگریزوں نے جو ایک مہذب قوم کہلاتے ہیں۔ اس کے جواب میں جو کچھ کیا وہ بھی بڑا شرمناک ہے۔ دراصل ۱۸۵۷ء کے واقعات کو آج کے معیاروں سے نہ دیکھنا چاہئے بلکہ اس زمانے کے مخصوص رجحانات کو ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یہ شورش ناکام رہی مگر اس کی وجہ سے ہندوستانی قوم کا تصور ابھرا۔ اسی نے بالآخر ہندوؤں اور مسلمانوں کو محض مذہبی بنیادوں سے بلند ہو کر سیاسی مقاصد کی خاطر متحد ہونے کا درس دیا۔ اس نے یہ دکھا دیا کہ عوام اگر جوش میں آجائیں تو کیا قیامت برپا کر سکتے ہیں۔ اس لئے اس واقعہ کی یادگار منانا اور اس سے اپنی قومی اور ملکی جدوجہد کی تاریخ شروع کرنا بالکل فطری ہے۔ تاریخ صرف واقعات کی کھتونی کا نام نہیں ہے۔ ان واقعات کے پیچھے جو اثرات چھپ کر رنگ دکھاتے ہیں ان کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں چند واقعات کی صحت کرنا کافی نہیں، پوری تاریخ کے بہاؤ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

انجمن کی کانفرنس

انجمن کی کانفرنس کے دعوت نامے جاری ہو چکے ہیں۔ یہ کانفرنس ۲۰ اور ۲۱ جولائی کو علی گڑھ میں منعقد ہوگی۔ اس موقع پر اردو کو علاقائی زبان بنانے کے لئے آئندہ اقدامات پر غور کیا جائے گا۔ انجمن کی تنظیم کو اور مضبوط کرنے کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ اردو رسم خط کے متعلق کمیٹی کی رپورٹ پر غور ہوگا۔ اردو لغت کی اسکیم کا خاکہ ملک کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ کانفرنس میں شرکت کے لئے شاخوں کے نمائندوں، ممتاز ادیبوں اور شاعروں، اہم صحافیوں اور ناشروں کو دعوت دی گئی ہے۔ کانفرنس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس عام ہے اور ہمارے پاس نہایت امید افزا خطوط آ رہے ہیں۔ اس موقع پر علاوہ زبان کی بقا اور ترقی کے مسائل پر غور کرنے کے، کچھ اہم ادبی مباحث کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔ کانفرنس کے افتتاح کے لئے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے درخواست کی گئی ہے۔ جو انجمن کے صدر رہ چکے ہیں اور ان کی رہ نمائی

میں یو۔پی میں علاقائی زبان کی تحریک چلائی گئی تھی۔ اس کی صدارت انجمن کے صدر کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ فرمائیں گے۔ مفصل پروگرام عنقریب "ہماری زبان" میں شائع ہوگا اور لوگوں کو بھیجا جائے گا۔ مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام انجمن کرے گی۔

بہار میں ادب اردو کی ڈاکٹریٹ

معلوم ہوا ہے کہ بہار یونیورسٹی نے سید محمد حسین کی تھیسس برہم پر "مرزا محمد علی فدوی، ان کا عصر، حیات اور شاعری" کو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے منظور کیا ہے۔

مرزا محمد علی فدوی شاہجہاں آباد کے ان مہاجر شعراء میں تھے جنھوں نے دہلی کے پر آشوب دنوں میں دہلی سے ہجرت کی اور پورب میں مقیم ہوئے۔ فدوی عظیم آباد میں سکونت پذیر ہوئے اور تاحم عظیم آباد۔ مہاراجہ کلیان سنگھ عاشق کی رفاقت میں انھوں نے اپنی زندگی کے بقیہ دن گزارے۔ فخر بہار شیخ غلام علی راسخ فدوی کے شاگرد تھے اور مشہور شاعر میر حسن ان کے گہرے دوستوں میں تھے۔ پٹنہ اور گرد و نواح میں ان کے ایک شعر کا ثانی مصرعہ بہت مشہور ہے

ایک ساتھ ہو حسرت دل مرحوم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس تحقیقی مقالہ میں بہار اور عظیم آباد کی پچھلی دو سو برس کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دبستان عظیم آباد کے وجود اور اس کی خصوصیات کو قطعی طور پر منظر عام پر لایا گیا ہے اور فدوی کا کل دستیاب شدہ کلام پیش کیا گیا ہے۔

سید محمد حسین ریاست بہار کے پہلے ڈاکٹر ہیں۔ جنھوں نے ادب اردو میں پی۔ ایچ ڈی کیا ہے۔ اس لحاظ سے ڈاکٹر عظیم الدین احمد مرحوم اور ڈاکٹر محمد اقبال صدر شعبۂ فارسی، پٹنہ یونیورسٹی کے نام آتے ہیں جو ادب عربی اور ادب فارسی میں اس صوبے کے پہلے ڈاکٹروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک معروف ادیب اور کامیاب مدرس کی حیثیت سے ڈاکٹر سید محمد حسین کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ موصوف ملک کے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر سید محمد محسن کے چھوٹے بھائی ہیں اور گیا کالج کے شعبۂ اردو میں لیکچرر ہیں۔

ناندیڑ میں آل انڈیا مشاعرہ

ناندیڑ میں مئی کے تیسرے ہفتے میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہو رہا ہے۔ جس میں حضرت جگر مراد آبادی کے علاوہ اقبال احمد سہیل، حیرت سلطانپوری، عرش ملسیانی، بشیر بدر، آنند نرائن ملا اور نشور واحدی وغیرہ کی شرکت کی توقع ہے۔

مشاعرہ کی صدارت کے لئے مسٹر شنکر راؤ چیف ریونیو سکریٹری حکومت بمبئی سے ربط پیدا کیا جا رہا ہے۔

مشاعرہ کے انتظام میں کلکٹر ضلع، سول سرجن ضلع وغیرہ کے علاوہ مسٹر سکندر علی وجد ایڈیشنل سشن جج ناندیڑ بطور خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔

سنہ ۱۸۵۷ء

بسکہ فعّال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کئے شکوہ سوزش داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کئے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے غالبؔ*
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

(غالبؔ)

* بعض نسخوں میں یارب ہے۔

ایک تصحیح

"ہماری زبان" مورخہ ۰۰ اپریل کی اشاعت میں "تاپ ناتیجو" کے عنوان سے ایک مراسلہ جناب ہارون خان شیروانی کا شائع ہوا ہے اس میں پہلا سوال "تیجو" کے بجائے "اردو" چھپ گیا ہے۔ سوال اب اس طرح پڑھا جائے "ہندوستان یا صوبہ جات اردو کے دنیا کی کسی زبان کے اخبار رسالے اور کتابیں "تیجو" میں چھاپی جاتی ہیں؟"

ناظرین نوٹ کرلیں۔ (ادارہ ہماری زبان)

اردو دنیا

مسٹر کرشنکو کی اردو میں گفتگو

حیدرآباد ۱۰ اپریل۔ روسی سفارت خانہ ہند کے نمائندے مسٹر کرشنکو نے جو اردو سے بھی واقف ہیں۔ وزیر فینانس ڈاکٹر بی گوپال ریڈی سے اردو میں بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ سوویٹ روس کی تمام قومیتوں کو اپنی تہذیبی ترقی اور ادب اور آرٹ کو فروغ دینے کی ساری سہولتیں حاصل ہیں۔ مسٹر کرشنکو روسی تعلیمی نمائش میں آویزاں مختلف تصاویر اور روسی ادیبوں کی تصانیف کے سلسلے میں استفسارات کا جواب دے رہے تھے۔ مسلم جمہوریتوں میں بولی جانے والی زبان کے متعلق ایک استفسار کے جواب میں انھوں نے بتایا کہ ان میں فارسی بھی بولی جاتی ہے اور یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے فارسی ادب اور شاعری سے گہرا اثر حاصل کیا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر گوپال ریڈی نے مسز شاہجہاں بیگم سے مخاطب ہو کر کہا کہ پھول ڈیلیگیشن لے جانے کا کب ارادہ ہے اس پر شاہجہاں بیگم نے کہا دیر کس بات کی ہے آپ جب بھی کہیں۔

ڈاکٹر گوپال ریڈی نے کہا آپ [illegible] ہیں۔ یہاں اس کا فیصلہ تو آپ ہی کر سکتے ہیں۔

الیکشن میں اردو

دراصل اردو کا مسئلہ ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کے لئے ایک کسوٹی ہے۔ اگر کوئی جماعت واقعی حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو فرقہ پرستی سے بالاتر سمجھتی ہے تو سب سے پہلے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ نہایت غیر مبہم طور پر نہ صرف اردو کے مسئلہ پر اپنے موقف کی وضاحت کرے بلکہ وعدوں کی پرانی راہوں سے ہٹ کر اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لئے کوئی موثر عملی اقدام بھی کرے۔ رسمی طور پر اردو کو ملک کی علاقائی زبانوں میں شامل کر کے مطمئن ہو جانا بہت ہی مضحکہ خیز بات ہے جسے اب ختم ہو جانا ہی بہتر ہے۔

حقیقتاً اگر اردو ہندوستان کے کسی علاقے کی زبان ہے تو وہ علاقہ اس کو ملنا چاہئے۔ ورنہ دستور میں اس کا ذکر ہی بیکار ہے جس سے نہ اردو کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور نہ اردو بولنے والے کروڑوں عوام کو۔ زبانی طور پر اردو کی حمایت میں بہت کچھ کیا جا چکا ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ الیکشن میں فرقہ پرست جماعتوں کی کامیابی کے بعد غیر فرقہ پرست جماعتیں اردو کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتی ہیں۔ (مولانا حبیب الرحمن صاحب ندوی کے مضمون سے اقتباس)

ظفر علی اکیڈمی کے لئے مالی امداد

لاہور۔ پاکستان کے ممتاز صحافیوں ادیبوں اور سیاسی رہنماؤں نے مرکزی و صوبائی حکومتوں سے اپیل کی ہے کہ ظفر علی خاں اکیڈمی کو مالی امداد دینے میں فراخ دلی اور فیاضی سے کام لیا جائے۔

پاکستان میں غیر صحت مند ادب کی درآمد ممنوع

کراچی۔ مرکزی حکومت نے بحری، بری اور ہوائی راستے سے پاکستان میں ایسی تمام کتابوں، جرائد، پمفلٹ یا دیگر مطبوعات کی درآمد ممنوع قرار دے دی ہے جن میں تصویروں کی مدد سے یا پورے طور پر تصویروں میں ایسی کہانیاں بیان کی گئی ہیں جو جرائم اور تشدد یا ظلم کے ارتکاب یا نفرت انگیز یا ہیبت ناک واقعات سے متعلق ہوں۔ یہ اعلان غیر معمولی گزٹ مورخہ ۹ اپریل میں کیا گیا ہے۔

بھارت کے ایک اردو شاعر کو وظیفہ

نئی دہلی۔ بھارت کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے گیا کے مشہور اردو شاعر مولوی سید عباس کے لئے ایک سو روپے ماہوار کا وظیفہ منظور کیا ہے۔ ۸۰ سالہ شاعر گورنمنٹ گرلز اسکول گیا میں ٹیچر ہیں۔

جگر مرادآبادی ایک فلم میں

بمبئی۔ بسنت اسٹوڈیو نے ایک غیر معمولی فلم تیار کی ہے۔ اس میں مشہور شاعر جگر مرادآبادی خود آئے ہیں اور اپنی دو مشہور غزلیں سناتے ہیں۔ ان کی غزلیں سننے والے حاضرین میں شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، اختر الایمان اور [illegible] شامل ہیں۔

انجمن کی خبریں

بمبئی

ایک ادبی جلسہ

انجمن ترقی اردو شاخ بمبئی کے زیر اہتمام جمعہ ۱۹ اپریل ۵۷ء رات کو ۸½ بجے بمقام صابو صدیق ہال ایک خصوصی جلسہ منعقد ہوا جس میں جناب کرشن داس دیلا صاحب جنھوں نے اردو، فارسی ہندی اور دوسری کئی زبانوں کے گہرے مطالعے کے بعد ان زبانوں کا ہم مضمون کلام اکٹھا کیا ہے، خصوصی مہمان تھے۔ اس کے بعد دیلا صاحب نے اس نشست میں مختلف زبانوں کے شعراء کا وہ کلام پیش کیا جس میں ایک ہی طرح کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اقبال، جگر، ٹیگور، کبیر، سرمد وغیرہ کے اشعار پیش کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب نے ایک دوسرے کے خیالات سے متاثر ہو کر اپنے کلام میں رنگ بھرا ہے۔ آخر میں انھوں نے اردو شاعری کے اساتذہ کے ہم مضمون اشعار شراب، آنسو، شمع وغیرہ عنوان کے تحت اپنے مخصوص ترنم میں پڑھ کر سنائے اور سامعین کو محظوظ کیا اور اعلان کیا کہ ان کا ارادہ ہے کہ مختلف زبانوں کے بولنے والوں میں محبت اور ہم آہنگی بڑھانے کی خاطر وہ ایک ادارہ بھاشا سنگم قائم کریں گے اور اس کا افتتاح بمبئی میں کریں گے جو حقیقی معنوں میں بھاشا سنگم ہے۔ اختتام پر سکریٹری نے مہمان اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور قریب ڈیڑھ گھنٹے کے بعد یہ دلچسپ محفل شعر برخاست ہوئی۔

غزل

ہم غمِ دہر کے اسرارِ نہاں تک پہنچے
سنگ سے کارگہِ شیشہ گراں تک پہنچے

سجدہ بن کر کبھی محرابِ حرم سے گزرے
رنگ بن کر کبھی رخسارِ بتاں تک پہنچے

غازۂ چہرۂ ہستی کی طلب میں اکثر
مہر و مہ چھوڑ کے ہم کاہکشاں تک پہنچے

حسنِ فطرت سے ملا عظمتِ انساں کا سراغ
لالہ زاروں سے چلے لالہ رخاں تک پہنچے

ہم ترے واسطے لے آئے ہیں رعنائے حیات
خاک سے اٹھ کے ستاروں کے جہاں تک پہنچے

ذرۂ خاک ہے طوفانِ قیامت بکنار
اپنی ہمت سے ہم اس تاب و تواں تک پہنچے

شوقِ تسخیر میں تاروں پہ کمندیں ڈالیں
نور لینے کے لئے برقِ تپاں تک پہنچے

تیرے دیوانے رہے شانہ بکف تیشہ بدوش
زلفِ شیریں سے چلے کوہِ گراں تک پہنچے

لب تک آئے نہ فریدی غمِ دل کے شکوے
حلقہ بن کر خمِ گیسوئے بتاں تک پہنچے

(مغیث الدین فریدی)

بلند شہر

تحریری انعامی مقابلہ

انجمن ترقی اردو شاخ بلند شہر نے ایک "تحریری انعامی مقابلہ" کا اہتمام کیا ہے جس میں طالب علم، اردو داں اور دیگر اقسام کے حضرات شریک ہو سکتے ہیں جن صاحب کا مضمون اول ہوگا ان کو چند کتابیں نذر کی جائیں گی۔

مضمون نگار حضرات ذیل کے عنوانات پر مضمون لکھیں۔

(۱) اردو کی ترقی و ترویج کے ممکن ذرائع۔
(۲) حضرت نوح ناروی
(۳) اردو رسم خط

نوٹ: مضمون نگار حضرات کو مندرجہ ذیل شرائط کا غائر مطالعہ کرنا چاہیے۔

(۱) مضمون خوشخط اور ورق کے ایک ہی جانب لکھا جانا چاہیے۔
(۲) مضمون بڑے اختصار سے لکھا ہونا چاہیے۔
(۳) مضمون نگار کی مختصر سوانح حیات لکھی ہونی چاہیے۔
(۴) مضمون دس صفحات (فل اسکیپ) پر مشتمل ہونا چاہیے
(۵) مضمون کے اختتام پر مضمون نگار کا مکمل پتہ ہونا ضروری ہے۔
۶۔ مضمون کے ساتھ ۲ آنے کے کورٹ فیس یا ۱۰ نئے پیسے (جدید) کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں۔
۷۔ مضمون چھپا یا پنسل سے نہ لکھا ہونا چاہیے ورنہ مشکوک تصور کیا جائے گا اور شریک مقابلہ نہ ہو سکے گا۔
۸۔ مضمون ارسال کرنے کی آخری تاریخ ۳۰ جولائی ہے۔
۹۔ مضمون انجمن ترقی اردو شاخ بلند شہر کے پتے پر آنے چاہئیں۔

جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو
شاخ بلند شہر، یوپی

کتابیں ——— جو جیل میں لکھی گئیں

حال میں دو ایسے اشخاص نے جنھیں سزائے موت سنائی جا چکی تھی جیل کی کوٹھری میں دو ایسی کتابیں لکھی ہیں جو لاکھوں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام ہے "کوٹھری نمبر ۲۴۵۵" اس کتاب میں قیدی کیرل چیسمین نے اپنی ان مساعی کا تذکرہ کیا ہے جو گزشتہ آٹھ سال میں اس دلچسپ نے جیل کوٹھری کے گیس چیمبر سے بچنے کے لئے کی ہیں۔ دوسری کتاب تھامس ای گیڈس کی ہے جس نے BIRDMAN OF ALCATRAZ میں اس سے بھی زیادہ ناقابل یقین داستان سنائی ہے۔

کیرل چیسمین کو جونہی جیل بھیجا گیا اس نے جیل کی لائبریری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان قوانین کا مطالعہ شروع کردیا جو اُس کی سزا سے متعلق تھے اور قانونی موشگافیوں سے وہ اپنی سزا کو برابر ملتوی کراتا رہا۔

کتاب میں وہ ایک ایسا ذہین قانون داں دکھائی دیتا ہے جو اگر امن پسند ہوتا اور قانون کی شاہراہ پر چلتا تو باعزت شہری بن سکتا۔

گیڈس نے اپنی کتاب میں ایک قیدی تھامس کراؤڈ کا ذکر کیا ہے جو ان تمام پرندوں کا مطالعہ کرتا تھا جو الکاٹراز کے جیل کی کوٹھری پر آتے تھے۔ جیل میں اس نے کسی نہ کسی طرح دو مرغے اور ایک مرغی حاصل کی اور ان کی افزائش شروع کردی اور جب ان مرغوں میں ایک مہلک بیماری پھیل گئی تو اس نے ناخن سے چیر پھاڑ کیا اور بیماری کی وجہ اور علاج معلوم کیا پھر ایک کتاب لکھی "پرندوں کے امراض" اس کا شمار معیاری کی حد تک سرکردہ کتابوں میں کیا جاتا ہے۔

دنیا کی کئی اور ادبی کتابیں جیل میں لکھی گئیں مثلاً ہٹلر نے مائن کیمف (میری جدوجہد) لینڈسبرگ جیل میں لکھی۔ گاندھی جی کی "تلاش حق" اور نہرو جی کی "میری کہانی" بھی جیل ہی میں مکمل ہوئی۔

ایک اور معرکۃ الآرا کتاب "..." ہٹلر کا قیدی تھا، سٹیفن لوہان کاغذ کے پرزوں، لفافوں کے پشت درداں اور ایسی ہی اشیاء پر لکھ کر جیل سے باہر بھیجتا رہا اور جب وہ رہا ہوا تو اس نے مسلسل کی کڑیاں ملا کر کتاب مرتب کی جو لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئی۔

ولیم اوسٹڈلی پورٹر نے جو "او ہنری" کے نام سے مشہور ہے اس وقت تک ایک سطر نہیں لکھی جب تک وہ خورد برد کے الزام میں جیل نہ بھیجا گیا۔ وہاں چونکہ وہ علم الادویہ سے واقف تھا اس لئے جیل میں ڈاکٹر کی امداد کے لئے یہاں اسے بہت سی مراعات دی گئیں۔ وہاں ایک قیدی سے وہ جو افسانے سنتا انہیں لکھ کر رسائل کو بھیجا کرتا تھا۔ ایک افسانہ تو ایک مذہبی میگزین میں بھی شائع ہوا۔ پانچ سال کی قید کے اختتام تک وہ ایک ادیب کی حیثیت سے نام پیدا کرچکا تھا۔ اسے اپنی کتابوں کا کافی معاوضہ بھی ملا۔

دوستووسکی کو انقلابی خیالات کی تشہیر کے جرم میں اس کے خطرناک قلعہ میں نظر بند کیا گیا تھا جہاں اس نے THE FAMILY FRIEND لکھی۔ "جرم و سزا" کی پلاٹنگ بھی جیل ہی میں کی۔

جب لی ہنٹ کو پرنس ریجنٹ کی توہین کے سلسلے میں دو سال کی قید کی سزا ملی تو جیل میں اسے لکھنے پڑھنے کی سہولت دی گئی تھی۔ اس نے "اسٹوری آف ریمنی" اور "دی ڈسنٹ آف لبرٹی" نامی دو کتابیں لکھیں جو ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوئیں۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ آخر میں حکومت نے اُسے پنشن مقرر کی۔

جرمنی کے ... شاعر نے جیل میں اپنی بہترین تصانیف لکھیں۔ آسکر وائلڈ نے اپنی کتابیں GAOLBALID OF PROFOUNDIS DEAY اور READING بھی جیل ہی میں لکھی۔ انجیل کے اکثر حصے بالخصوص سنٹ پال سے متعلقہ جیل ہی میں مکمل ہوئے۔ اسی طرح بنیان کی پلگرمس پروگریس اور دیگر بکس کے گریٹ ورک۔ جیل میں لکھے گئے۔

والٹر ریلے نے اپنی مشہور "تاریخ عالم" ٹاور آف لندن میں اسی وقت لکھی جب اسے سزائے موت سنائی۔ جیل میں سروینٹیس نے ڈان کوئیکزوٹ اور مارکوپولو نے قبلائی خان سے ملاقات کے واقعات لکھے۔

١٨٥٧ء کے واقعات روسیوں کی نظر میں

سوویت یونین کے علما ہندوستان کے ١٨٥٧ء کے غدر کا مطالعہ بہت دلچسپی سے کرتے ہیں۔ اس دلچسپی کی بنیاد تاریخ کا یہ نظریہ نہیں ہے کہ تاریخ داخلی تصورات کا ایک مجموعہ ہے بلکہ وہ تاریخ کو خارجی قوانین کا سلسلہ سمجھتے ہیں جن کے مطالعہ سے وہ سمت سمجھ میں آتی ہے جس طرف سماج آگے بڑھ رہا ہے۔ ماضی میں ہندوستانی عوام کی دلیرانہ جدوجہد آج ہندوستان کا ایک عظیم ملک کی شکل اختیار کرنا اور آئندہ ترقی کے امکانات وہ موضوعات ہیں جو ہندوستان کی تاریخ کے مطالعے کو دلچسپ اور ذمہ داری کا کام بنا دیتے ہیں۔

سوویت علما کا کہنا ہے کہ ہندوستان کا غدر سب واقعات سے الگ تھلگ چیز نہیں ہے۔ ہندوستان کا غدر، چین میں تائی پنگ بغاوت، ایران میں باب کی تحریک اور انڈونیشیا میں آزادی کا فروغ یہ سب قوموں کا ان کوششوں کے خلاف ردعمل تھا کہ ان ملکوں کو نوآبادیاں بنا لیا جائے۔

ہندوستان کے غدر کا رخ انگریزی راج کے خلاف تھا اور کسان دستکار اور سپاہی اس کے روح رواں تھے لیکن ان قوتوں کے ساتھ سامنتی قوتیں بھی تھیں جن کی رہنمائی ان رجواڑوں کے ہاتھ میں تھی جن کی ریاستیں انگریزوں نے چھین لی تھیں اور جنھوں نے یہ سمجھا کہ یہ موقع ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی ریاستیں پھر سے واپس لے لیں۔ ہمارا غدر کی اصل کمزوری تنظیم کا فقدان تھی۔

اس بات کے باوجود کہ غدر کو دبا دیا گیا۔ اس نے ہندوستان میں قومی شعور کو ترقی دینے میں غیرمعمولی طور پر اہم پارٹ ادا کیا اور ایک مضبوط بنیاد رکھ دی کہ سامراج دشمن عناصر مذہب، ذات، پات یا زبان کے اختلافات کو نظرانداز کر کے مشترکہ طور پر جدوجہد کریں۔

مختلف قسم کی ان قوتوں کے عارضی اتحاد کی بدولت باغیوں کو ابتدائی کامیابیاں ہوئیں۔ لیکن بعد میں یہی حقیقت ان کی کمزوری کا باعث ہوئی۔ چند جاگیرداروں رتانتیا ٹوپی، لکشمی بائی وغیرہ کے علاوہ باقیوں نے بغاوت سے غداری کی اور کسان اور دستکار خود اپنے ایسے رہنما پیش نہ کر سکے جو ذمہ داریاں پوری کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں اور اگرچہ انجام کار بغاوت ناکام ہوئی اور اس کی ایک وجہ ملک کی قدرے معاشیاتی پسماندگی اور انتشار بھی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے بڑا ہی ترقی پسندانہ حصہ ادا کیا۔

سوویت تاریخ دانوں کی رائے ہے کہ کسی تاریخی واقعے کی حیثیت کا صحیح صحیح تعین تاریخی حالات کی جانب خارجی رویہ اختیار کرنے کی بنیاد پر ہی کیا جا سکتا ہے۔

بغاوت میں عوام الناس کی شرکت بدلحاظ اس کے کہ ان کا طبقاتی شعور کیا تھا اور چاہے وہ جاگیردارانہ نعروں کے تحت ہی اس میں شریک کیوں نہ ہو سکے ہوں، جاگیردارانہ نظام پر ضرب کاری لگاتی ہے۔ یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہئے کہ وسط انیسویں صدی کا ہندوستان مغلوں کے زمانے کا ہندوستان نہ تھا۔ اس وقت تک یہ ملک عالمی منڈی کی زد میں آچکا تھا اور وہاں یورپ کے تعلیم یافتہ دانشوروں کا ایک طبقہ بھی پیدا ہو چکا تھا اگرچہ تعداد کے اعتبار سے وہ بہت ہی چھوٹا سا تھا۔ فیکٹریوں میں شروع شروع کی دخانی مشینیں، تار برقی اور ریلیں ہندوستان میں چل پڑی تھیں۔ اس میں تو کلام نہیں کہ اگر ١٨٥٧ء کے باغی کامیاب ہو گئے ہوتے تو سرمایہ داری کی راہ پر ہندوستان کی نشوونما اور ترقی کہیں زیادہ تیز رفتار ہوتی ترقی ایک خودمختار ملک کی طرح ہوتی نوآبادی کی طرح نہیں۔

١٨٥٧ء - ١٨٥٩ء کے واقعات کی زبردست تاریخی اہمیت یہ ہے کہ جنگ آزادی نے انگریزوں کی فوق القدرت طاقت کا طلسم توڑ دیا اور دکھا دیا کہ میدان جنگ میں انھیں بھی شکست ہو سکتی ہے ہندوستان میں ان کی حکومت کے ناپائدار اور غیرمحفوظ ہونے کا راز بھی فاش کر دیا اور اس بغاوت نے عوام الناس کو یہ بھی بتا دیا کہ ملک کی آزادی کی لڑائی میں جاگیرداروں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

(سوویت دیس)

معاصرین

ہند و پاک کا عظیم الشان اردو مشاعرہ جو اسی مارچ میں دہلی میں دھوم دھام سے منعقد ہوا تھا، کسی جھونپڑی میں نہیں بلکہ نئی دہلی کی ایک سرکاری اور قابل دید عمارت وگیان بھون میں جہاں کچھ ہی روز قبل یونسکو کا اجلاس ہو چکا تھا اور کہنا چاہیے کہ نیم سرکاری سرپرستی میں منعقد ہوا تھا۔ اس کی صدارت آپ کو علم ہے کہ یونین کے وزرائے نامدارین میں سے کس نے کی تھی؟ مولانا ابوالکلام نے نہیں، ڈاکٹر سید محمود نے بھی نہیں بلکہ پہلے تو وزیر خوراک شری اجیت پرشاد جین نے اور پھر دوسری نشست میں نائب وزیر دفاع سردار سرجیت سنگھ مجیٹھیا نے۔ اردو مشاعرے کا مہتمم اعلیٰ اور سکریٹری کون تھا؟ کوئی مسلمان شاعر نہیں۔ پنڈت ہری چند اختر!۔۔۔۔۔ پھر اس کے لئے ہزارہا ہزار کے مصارف کہاں سے آئے؟ کسی نواب یا نواب زادہ کی جیب سے نہیں بلکہ دہلی کے مشہور ساہوکار اور دلی کلاتھ اینڈ جنرل ملز کے آنجہانی مالک سر شنکر لال شنکر اور لائل پور کاٹن ملز کے آنجہانی مالک لالہ مرلی دھر شونو کے قائم کئے ہوئے فنڈ سے۔

مشاعرہ کے دوسرے کرتا دھرتا بعد ہری چند اختر کے منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی تھے۔ اور ہندوستان کے جن شاعروں نے اپنا کلام شوق کے ساتھ سنایا، اور پاکستانی مہمانوں کا تپاک کے ساتھ خیر مقدم کیا، ان میں جہاں روشن صدیقی اور ساغر نظامی تھے وہیں مہندر سنگھ بیدی سحر، جگن ناتھ آزاد، رگھوپتی سہائے فراق، بالمکند عرش اور بیج ناتھ رعنا بھی تھے! اور دو بجے رات تک جاگ کر شوق و اشتیاق سے سننے والوں اور داد دینے والوں کے مجمع میں جہاں بکثرت مسلمان تھے، وہیں اسی کثرت سے ہندو اور سکھ بھی تھے! اور جس نے غالب کے مصرعہ پر گرہ لگا کر یہ چلبلا شعر سر محفل پڑھا سنایا وہ

یارب! وہ سنا ہے وہ سمجھتے نہیں اردو
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

وہ کوئی میاں صاحب نہ تھے، بالمکند عرش ملسیانی ہی تھے!

۔۔۔ لیکن پھر کریں یہ سارے واقعات و حقائق۔ آپ یہ ساری سرگزشت سنی ان سنی کر جائیے، ان سارے مشاہدات کی طرف سے آنکھیں میچ لیجئے، اور بس یہی کہے جائیے کہ اردو بھی کوئی زبان ہے۔ ملک کی زبانوں میں چودھویں نمبر پر جگہ پانے والی اور وہ بھی جواہر لال کی مسلم نوازی کے صدقے میں! وہ زبان اگر ہے بھی تو تھوڑے سے ملانوں کی، ورنہ کسی ہندو اور کسی سکھ کو اس سے واسطہ کیا۔

(صدق جدید لکھنؤ)

پنجاب میں اردو کا تحفظ

اس وقت میرے سامنے پنجاب یونیورسٹی کے منشی فاضل کے امتحان کا نتیجہ ہے۔ اس امتحان میں جو طلبہ کامیاب ہوئے ہیں ان میں امتیازی حیثیت ہندو طالب علموں کی ہے۔ اول آنے والے طالب علم چمن لال گپتا نے ۳۰۳ نمبر حاصل کئے ہیں۔ دوم نمبر پر آنے والا طالب علم ایک سکھ رتن سنگھ ہے جس نے ۲۲۳ نمبر حاصل کئے ہیں۔ تیسرے درجے پر جو طالب علم آیا ہے اس کا نام بشیشر ناتھ ہے وہ ۳۰۰ نمبر لے کر کامیاب ہوا ہے۔ چوتھا امتیازی درجہ بھی ایک ہندو طالب علم نے ۲۰۰ نمبر لیکر حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد ایک مسلمان طالب علم ضیاء الحق کا نام آتا ہے جس نے ۲۱۸ نمبر حاصل کئے ہیں۔ چھٹا، ساتواں، آٹھواں، نواں اور دسواں امتیازی درجہ بھی ہندو اور سکھ طالب علموں نے حاصل کیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: رگھوناتھ سنگھ، ملک دونی چند، منوہر لال وہرا، ملک لال چند اور رام مہر۔

مجھے پنجاب یونیورسٹی کے اس نتیجہ کا اعادہ کرنے کی ضرورت یہاں اس لئے درپیش آئی ہے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ پنجاب سرکار یا پنجاب کے محکمہ تعلیم کا یہ نظریہ غلط ہے کہ چونکہ پنجاب میں مسلمان نہیں ہے یا بہت کم ہیں اس لئے یہاں اردو اور فارسی کی تعلیم جاری رکھنا بے سود ہے۔ اس نتیجہ کو دیکھ کر پنجاب سرکار کو کم از کم یہ احساس تو ہونا چاہیے کہ اس اسٹیٹ میں اب ہندوؤں میں فارسی اور اردو پڑھنے کا شوق ختم نہیں ہوا، اور اردو اور فارسی زبان کی اس کسمپرسی کی حالت میں بھی وہ اس میدان میں مسلمانوں سے گوئے سبقت لے جا سکتے ہیں۔

اگرچہ کہ آج پنجاب میں اردو اور فارسی زبانوں کو فروغ حاصل ہو اور سکولوں اور کالجوں میں ان زبانوں کی پڑھائی کے مناسب اور تسلی بخش انتظامات ہوتے تو جہاں فارسی اور اردو پڑھنے والے ہندو طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے وہاں امتیازی پوزیشن کے حصول کے سلسلے میں بھی ان کا پلڑا بھاری ہوتا۔

بہرحال پنجاب یونیورسٹی کے یہ نتائج اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ پنجاب سرکار اردو دشمن پالیسی کے باوجود پنجاب میں اردو اور فارسی پڑھنے کا ذوق ختم نہیں ہوا۔ یہ درست ہے کہ پنجاب سرکار کی اگر یہی پالیسی رہی تو اس صوبے سے اردو ختم ہو جائے گی۔ ہمارے موجودہ حکام میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جو اردو کی اہمیت سے واقف ہو لیکن اس کے ساتھ کہنا یہ ہے سرکار اس الزام سے نہیں بچ سکتی کہ اردو کا جنازہ اس نے اپنے کندھوں پر نکالا ہے۔ ورنہ اس کے مٹانے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

(روزنامہ ملاپ جالندھر)

گورنر کی زبان سے

(گورنر مدراس (اور موجودہ گورنر بمبئی)

ہز اکسیلنسی شری سری پرکاش کی تقریر فروری ۱۹۵۶ء میں اے۔پے اردو سیمینار (مدراس) کے موقع پر۔

"بھائیو اور بہنو میں اپنے آپ کو آپ لوگوں کے درمیان پاکر بیحد خوش ہوا ہوں۔ میں آپ لوگوں کا دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہ موقع عطا فرمایا۔ آپ لوگ ایسی زبان بولتے ہیں جو میں سمجھتا ہوں آپ ہی لوگوں کی وجہ سے میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ میں اپنے وطن سے دور نہیں ہوں۔ آپ لوگ شاعروں کی میٹھی بولی سنتے آئے ہیں۔ میں اپنے پھیکے الفاظ سے اس لطف کو کم کرنا نہیں چاہتا ہمیں بہت دنوں کے بعد آزادی ملی ہے۔ ہمیں ایسا کام نہیں کرنا چاہئے جس سے آزادی پھر خطرے میں پڑ جائے۔ ہمیں اردو زبان کی تاریخ سے سبق لینا ہے۔ مختلف قوموں کے میل ملاپ سے یہ میٹھی زبان پیدا ہوئی ہے۔ میل ملاپ سے ہماری زندگی خوشگوار بن سکتی ہے۔" (فانوس خیال مدراس۔ سالنامہ بابت ۱۹۵۶ء صفحہ ۵)

یہ گورنر صاحب اردو زبان کے قائل نہیں بلکہ ملک کے بعض طبقوں میں اس کے پھیلے ہونے کے قائل ہیں! اور یہی نہیں بلکہ انہیں اردو والوں کی ہم زبانی کی بنا پر اپنے کو پردیس (مدراس) کے اندر دیس (بنارس) میں سمجھ رہے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اردو کو مثال میں پیش کرکے تفرقہ و جدائی کا نہیں بلکہ اتحاد اور میل ملاپ کا سبق حاصل کر رہے ہیں اور اردو زبان کی مٹھاس کا اقرار کھلم کھلا کر رہے ہیں۔ یوپی سرکار کی فراخ دلی اور دلی رواداری و ضبط و تحمل کے لئے یہی بہت ہے کہ ایسی تقریر دل کے جواب میں وہ کوئی بیان نہیں شائع کرتی! ـــــــ خوب ہے یہ بنارس کی سرزمین بھی جو ایک طرف جنم دیتی ہے ایسے اردو نواز گورنر کو تو دوسری طرف ایک مشہور اردو کش چیف منسٹر کو!

(صدق جدید)

مراسلات

ہماری صحافت

ہماری زبان کی پچھلی دو چار اشاعتوں میں ایسے اخباروں اور رسالوں کی فہرست شائع ہوئی ہے جو ہماری زبان اور اردو ادب کے تبادلے میں آتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ایسے اردو ہفتہ وار، پندرہ روزہ اخبار، ماہنامے اور روزنامے ہیں جو پابندی اوقات شائع ہو رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ہر سال مختلف جامعات اور کلیہ جات سے کئی اردو رسائل شائع ہوتے ہیں کیا ہی اچھا ہوتا کہ ایسے تمام اخبار و رسائل کی ایک مکمل فہرست شائع کردی جاتی جس سے ظاہر ہو جاتا کہ اردو کو ختم کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود اتنے اخبار و رسائل شائع ہو رہے ہیں یہ ایک کام کی چیز ہوتی۔

(محمد عبید اللہ شریف)

نصیر الدین ہاشمی

ہماری زبان میں خلیل الرحمن صاحب کے مضامین کافی دلچسپ ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کو وسعت دی جائے گی۔ علی ہذا ڈاکٹر مختار الدین صاحب آرزو کے مضامین معلومات آفریں ہوتے ہیں۔ یورپ میں اردو کا جو ذخیرہ محفوظ ہے۔ ان سے میں نے صرف دکنیات کا استفادہ کیا تھا اردو کا ایسا ذخیرہ بہت زیادہ تھا جس سے میں نے استفادہ نہیں کیا تھا۔ مختار الدین صاحب نے ان سے استفادہ کرکے بہت کچھ مسالا مہیا کیا ہوگا جو ہمدردان اردو کے لئے دلچسپی کا سامان ہوسکتا ہے۔ امید ہے آپ نے کتب خانہ سالار جنگ کی وضاحتی فہرست کا مطالعہ کیا ہوگا۔ ہماری زبان میں اس کے ریویو کا منتظر ہوں۔ نقد اختتام بھی ضرور ملاحظہ کیجئے۔

میری ایک کتاب جو "دکنی ہند اور اردو" سے موسوم ہے ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے شائع ہونے والی ہے۔ اس کا "پیش لفظ" ہز اکسیلنسی بی رام کرشنا راؤ گورنر کیرالا نے قلم بند کیا ہے کتاب کے شائع ہونے میں ایک ماہ کا عرصہ ہوگا کیا اس پیش لفظ کو "ہماری زبان" میں شائع کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ اس کو مناسب تصور کریں تو یہ پیش لفظ ارسال خدمت کیا جا سکتا ہے۔

یونسکو کا ترجموں کا پروگرام

کسی قوم کی تہذیب کو سمجھنے کا سب سے آسان راستہ اس کے ادب کے ذریعے ہے لیکن یہ ہمیشہ اس لئے ممکن نہیں ہوتا کہ زبان کی دشواریاں آڑے آتی ہیں۔ یونسکو نے اپنے ذمے یہ کام لیا ہے کہ ایسی رکاوٹوں کو دور کرے اور ملکوں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنے کے لئے فضا سازگار کرے۔

۱۹۴۸ء سے جب کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے پہلے اجلاس نے یہ تجویز پیش کی، یونسکو مسلسل کوشش کر رہا ہے کہ ایسے تراجم کی برابر حوصلہ افزائی کی جائے جو مختلف رکن ریاستوں کی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہیں یہ ترجمے ایسی زبانوں میں ہونے چاہئیں جو زیادہ بولی جاتی ہیں۔

یونسکو ہر رکن ریاست کی بہترین تصانیف کو دوسری قوموں کی زبان میں ترجمہ کر کے باہمی مفاہمت پیدا کرنا چاہتی ہے جب پہلے پہل یہ منصوبہ شروع کیا گیا تو عربی سے تراجم اور عربی میں تراجم تک محدود تھا لبنانی حکومت سے معاہدے کے مطابق یونسکو نے بیروت میں ایک بین الاقوامی کمیشن قائم کیا جس کا مقصد اہم تصانیف کا ترجمہ تھا ۱۹۴۹ء میں یونسکو نے امریکی ریاستوں کی تنظیم کے تعاون سے اس منصوبے کو اور وسعت دیتے ہوئے لاطینی امریکی ادب کو بھی اپنے منصوبے میں شامل کر لیا۔ یونسکو نے ان تصانیف کو فرانسیسی میں ترجمہ کرنے کی ذمہ داری لی اور امریکی ریاستوں کی تنظیم نے اس سلسلے کو انگریزی میں منتقل کیا۔

آہستہ آہستہ یہ منصوبہ اور پھیلا اور اب اس میں اطالوی اور فارسی اور دیگر مشرقی زبانیں خاص طور پر ہندوستان، چین اور جاپان کی زبانیں آ گئیں۔ ۱۹۵۵ء تک یونسکو کے تراجم میں ۲۵ زبانوں کا ادب آ گیا۔ عربی، ارجنٹائن، بنگالی، بولیوین، برازیلی، چینی، کولمبیائی، کیوبان اور ڈومینکین، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، یونانی، ہندی، اطالوی، جاپانی، مرہٹی، میکسیکن، پنجابی، فارسی، سنسکرت، اسپینی، تھائی، تامل اور یوروگوئے کی زبان۔

اس کام کو یونسکو نے اس لئے اور بھی کیا کہ کسی کا ذاتی طور پر کرنا ممکن نہ تھا۔ کتابوں کا انتخاب اور ان لوگوں کا انتخاب جو ترجمے یا اشاعت کے ذمے دار قرار دئے جائیں، من مانے طور پر نہیں کیا جاتا۔ ۱۹۵۱ء تک یونسکو اور مختلف ممالک کی حکومتیں یہ انتخاب اتفاق رائے سے کرتی تھیں ۱۹۵۲ء میں یونسکو نے فلسفے اور انسانی علوم کی بین الاقوامی کونسل سے درخواست کی کہ وہ ماہرین کی ایک کمیٹی کو نامزد کرے جو اس کام کو انجام دے اس کمیٹی کا دو بار جلسہ ہوا۔ ایک بار ۱۹۵۲ء اور پھر دوسری بار ۱۹۵۵ء میں اس کے بعد یہ کمیٹی چار ذیلی کمیٹیوں میں تقسیم ہو گئی۔ لاطینی امریکی، اطالوی، مشرق وسطیٰ، ہندوستان اور مشرق بعید یونسکو نے بڑی حد تک اس کام کی تکمیل کر لی ہے۔

جن کتابوں کا ان منصوبوں کے تحت ترجمہ ہوا ہے وہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں جیسے منطق، جغرافیہ، طب، مذہب اور ادب۔ عربی سے جن کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے ان میں سے چند کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

KITABALISARAT WAL.. TANBIHAT;

KITAB ALBURHA ; TAHAFUTALTAHAFUT;

اسی طرح متعدد انگریزی اور فرانسیسی کتابیں عربی میں ترجمہ ہوئیں جن میں DON QUIXTE اور AWINTERS TALE شامل ہیں۔

لاطینی امریکی سلسلے میں دو تصانیف ہیں۔

ANTHOLOGIE DELA POESIE MEXICAINE جو میکسیکن شاعری کی نظموں کا مجموعہ ہے اور ایک دلکش ناول QUINCAS BORBA مصنفہ ماکیڈو دی اسس یہ انیسویں صدی کا ایک بہت بڑا ناول نگار تھا۔

DANESH NAMEH اور RECIT DE HAY YAQZAN دانش نامہ فارسی کی تصانیف ہیں جو فرانسیسی میں ترجمہ کی گئی ہیں انگریزی میں جاپانی ادب کا ایک مجموعہ تیار کیا گیا ہے جس میں ابتدا سے لے کر وسط انیسویں صدی تک کے ادب کا ایک انتخاب ہے جس سے جاپان کے عظیم ادب کا اندازہ ہوتا ہے اس میں دنیا کے عظیم ترین ناول اور مختصر ترین نظمیں اور ڈرامے شامل ہیں جن میں حکایات کے معجزے اور تخیل کی سحر طرازیاں ہیں۔

حال ہی میں یونسکو نے مرہٹی سے تکا رام کے بھجنوں کا فرانسیسی میں PSAUMES DU PELERIN کے نام سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ پہلی ہندستانی کلاسیکی کتاب ہے جو یونسکو کے اہتمام میں شائع ہوئی ہے اس ترجمے کے پروگرام کے تحت INDIAN INSTITUTE OF WORLD CULTURE, BANGALORE کی جانب سے ہندستانی وراثت THE INDIAN HERITAGE شائع ہوئی ہے اس میں سنسکرت ادب کا ایک اچھا انتخاب ہے جسے ڈاکٹر راگھون نے مرتب کیا ہے۔ آج کل بنکم چٹرجی کی کتاب کرشنا کانتا کی وصیت، گئودان، اور سکھوں کی مقدس کتاب "ادی گرنتھ" زیر ترتیب ہیں تو دودو کی تصنیف ھندگرال تامل سے شری راجگوپال آچاری ترجمہ کر رہے ہیں جو عنقریب شائع ہو جائے گی۔

پریم چند کی گئودان اور کبیر کے دوہے اور کشمیر کے شیو بھگتی صحیفے اور رگ وید کے کچھ بھجن بھی فرانسیسی میں ترجمہ کئے جا رہے ہیں۔

یونسکو نے جو کام اپنے ذمے لیا ہے وہ آسان نہیں ہے اس کی کامیابی کا معیار قوموں کی باہمی مفاہمت کا وہ فروغ ہے جو اس کام کے ذریعے سے ممکن ہو سکے گا۔ اس طرح قوموں کو یہ احساس ہو جائے گا کہ رنگ، نسل، مزاج اور زبان کے فرق کے باوجود افراد ہر جگہ ایک سے ہیں۔ ان میں وہی تخلیقی تمنائیں ہیں جو عظیم ادب کے ظہور کا باعث ہوتی ہیں۔ وہی قوت ایجاد ہے، وہی صداقت کی جستجو اور ایک بہتر دنیا تعمیر کرنے کا جذبہ ہے۔

بقیہ ہندستانی تھیٹر

ہندستانی تھیٹر کی بنیاد ہر زبان کی بہترین چیزوں پر ڈالنی چاہیے۔ یہ ایک مشکل مگر مقدس کام ہے جسے پیشہ ور اشخاص کو تجارتی منفعت کا خیال رکھتے ہوئے انجام دینا ہے۔ یہ کام حکومت کے کرنے کا ہے اور تھیٹر کے شائقین اس دن کے منتظر ہیں جب ان کی یہ خواہش پوری ہو گی

(بہ شکریہ انڈین لیسنر)

ہندی میں بچوں کے لئے کتابیں

لکھنؤ ۱۱۔ ۱پریل حکومت ہند نے بچوں کے ادب کے فروغ کے لئے ناشرین کی ہمت افزائی کے خیال سے تجربہ کار ناشرین سے درخواست کی ہے کہ وہ ایسی کتابوں کی اشاعت کو تجویز پیش کریں جو بچوں کے ادب کی ترقی میں معاون ثابت ہوں۔

یہ کتابیں غیر ملکی کلاسیکی ادب اور علم حیوانات کے متعلق ہونی چاہئیں۔ ہر ایک ناشر کو مجوزہ کتابیں حکومت کے مقرر کردہ فارم میں شائع کرنی ہوں گی۔ ایسی کتابوں کی قیمت وزارت تعلیم حکومت ہند کے مشورہ سے مقرر کی جائے گی۔ ناشرین کو لازمی طور پر اس قسم کے ادب کے متعلق اپنی سابق مطبوعات پیش کرنی ہوں گی۔

ہر ایک ناشر کو وزارت تعلیم کی منظوری کے بعد ہر ایک کتاب کی زیادہ سے زیادہ ۲ ہزار کاپیاں شائع کرنی ہوں گی۔

وزارت تعلیم نے منتخب شدہ ناشروں کو کتابوں کی اشاعت کے کل خرچ کا ۲۵ فیصد بطور امداد دینے کا فیصلہ کیا یہ امداد کتابوں کی اشاعت کے بعد دی جائے گی۔

حکومت ہند تمام منظور شدہ مطبوعات کی ۱۰۰۰ ہزار کاپیاں ۵۰ فیصدی تجارتی کمیشن پر خرید کرے گی اس سلسلے میں تمام درخواستیں ہر ایک کتاب کی اشاعت کے خرچ کی تفصیلات اور اسی نوعیت کے ادب کے متعلق سابقہ مطبوعات کے نمونوں کے ساتھ اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر (بی ۱۰) منسٹری آف ایجوکیشن گورنمنٹ آف انڈیا نئی دہلی کے دفتر میں ۱۵ مئی ۱۹۵۷ء تک پہنچ جانی چاہئیں

[illegible] پرنٹر پبلشر [illegible] نے [illegible] پریس میں چھپوا کر دفتر انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا